محمد اسحاق بھٹی

ایک حدیث

عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ رَضِیَ اللّٰہُ عنہ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ اللّٰہُ اَنَا عِنْدَ ظَنِّ عَبْدِیْ بِیْ وَاَنَا مَعَہٗ اِذَا ذَکَرَنِیْ فِیْ مَلَاءٍ ذَکَرْتُہٗ فِیْ مَلَاءٍ خَیْرٍ مِّنْھُمْ وَاِنْ تَقَرَّبَ اِلَیَّ شِبْرًا تَقَرَّبْتُ اِلَیْہِ ذِرَاعًا، وَاِنْ تَقَرَّبَ اِلَیَّ ذِرَاعًا تَقَرَّبْتُ اِلَیْہِ بَاعًا، وَاِنْ اَتَانِیْ یَمْشِیْ اَتَیْتُہٗ ھَرْوَلَۃً"۔ (بخاری، مسلم، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، مسند امام احمد)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ بیان کرتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ میں اس یقین کے مطابق ہوں جو میرا بندہ میرے بارے میں رکھتا ہے، اور میں اس کے ساتھ ہوں جب بھی وہ مجھے یاد کرے۔ اگر وہ مجھے اپنے جی میں یاد کرتا ہے تو میں بھی اپنے جی میں اسے یاد کرتا ہوں۔ اگر وہ مجھے کسی مجمع میں یاد کرتا ہے تو میں اسے اس مجمع سے بہتر مجمع میں یاد کرتا ہوں۔ اگر وہ میری طرف ایک بالشت بڑھتا ہے تو میں اس کی طرف ایک ہاتھ بڑھتا ہوں، اگر وہ میری طرف ایک ہاتھ بڑھتا ہے، تو میں اس کی طرف دو ہاتھ بڑھتا ہوں، اور اگر وہ میری طرف چل کر آتا ہے تو میں اس کی طرف لپک کر آتا ہوں۔

یہ حدیث قدسی ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے جو اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمانِ اقدس اپنی امت کے لوگوں کو پہنچایا۔ اس حدیث میں ایک لفظ "ظن" ہے، جس کے معنی ہیں بغیر دیکھے کسی شے کے بارے میں اپنے جی میں کچھ خیال کرنا۔ اس طرح کا خیال بالعموم یقین سے خالی ہوتا ہے۔ بنا بریں لفظِ "ظن" کا استعمال بھی عموماً "گمان" کے معنی میں ہوتا ہے لیکن بعض اوقات اس قسم کا خیال محکم عقلی دلائل پر مبنی ہوتا ہے اور پختہ یقین کی شکل اختیار کر لیتا ہے، اس لیے اس لفظ کا استعمال "ایمان بالغیب"، یعنی "بن دیکھے یقین" کے لیے بھی ہوتا ہے۔ خود قرآن مجید میں یہ لفظ اس مفہوم میں کئی مقام پر آیا ہے۔ زیرِ مطالعہ حدیث میں

بھی "ظن" سے یہی آخری معنی مراد ہیں۔ یعنی "دلائل و شواہد کی روشنی میں اللہ اور اس کی صفاتِ حسنہ پر ایمان بالغیب"!

اس حدیث میں ایک لفظ "عبدی" وارد ہے۔ یعنی اللہ فرماتا ہے، "میرا بندہ"۔ اس سے مراد وہ شخص ہے، جو اپنے مقامِ بندگی کے شعور سے بہرہ مند ہو اور جس نے اس شعور کے بعد اللہ سے عملاً تعلقِ بندگی قائم کر لیا ہو۔ یعنی مردِ مومن یا مخلص۔! حدیث میں مومن کی بجائے "عبدی" (میرا بندہ) کہنے سے عبدیت پر بھی زور دینا مقصود ہے اور اس سے بندۂ مومن سے اللہ کا قرب ظاہر ہوتا ہے۔

"میں اس یقین کے مطابق ہوں جو میرا بندہ میرے بارے میں رکھتا ہے"۔ حدیث کے ان الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، ایسا ہرگز نہیں ہوگا کہ میرا بندہ ایک بندۂ مومن کی حیثیت سے مجھ پر بھروسہ کرے، میرے وعدوں پر یقین کرے، میری رحمت و مغفرت کی آس لگائے، میری رضا کو اس توقع اور یقین کے ساتھ اپنا مقصدِ زندگی ٹھہرائے کہ میں اس پر اپنے فضل و کرم کی بارش کروں گا، مگر اس کی یہ توقعات غلط ثابت ہوں، ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، میں اس کی توقعات اور امیدوں کے مطابق ثابت ہوں گا میں دونوں جہان میں اس کا سہارا بنوں گا، میں اس سے ہمیشہ کے لیے راضی ہو جاؤں گا میں اس پر اپنی رحمت و مغفرت کا سایہ کروں گا، میں اسے اپنے دیدار اور تقرب سے سرفراز کروں گا، غرض یہ کہ دنیا میں اس کا مولیٰ اور کارساز ثابت ہوں گا اور آخرت میں اسے وہ سب کچھ دوں گا جس کا میں نے اس سے وعدہ کیا ہے۔

"میں اس کے ساتھ ہوں"۔ حدیث کا یہ جملہ اگرچہ بہت مختصر ہے مگر اپنے اندر بے وسعت رکھتا ہے۔ تسکین و تبشیر کے لیے اس سے بہتر شاید اور الفاظ نہ ہوں۔ یہ بڑے وسیع الفاظ ہیں۔ یعنی اللہ اپنے بندے سے اپنے تعلق قرب کا اس طرح اظہار کرتا ہے کہ میں اس سے دور نہیں ہوں، اس کے حالات سے بے خبر نہیں ہوں، اس سے بے پروا اور بے نیاز نہیں ہوں میں اس کے معاملات سے نہایت دلچسپی اور تعلق رکھتا ہوں، میری رحمت اس پر سایہ فگن ہے میری تائید و نصرت اسے حاصل ہے، میں اسے عمل خیر کی توفیق دیتا ہوں اور ارتکاب شر سے

نکلتا ہوں، مَیں اس کا کارساز اور مولیٰ ہوں۔ یہ تمام باتیں، حدیث کے الفاظ "میں اس کے ساتھ ہوں" میں شامل ہیں۔

"میں اس کے ساتھ ہوں، جب کبھی وہ مجھے یاد کرے" اس میں جملۂ اول کا ترتب جملۂ ثانی پر ہے۔ مطلب یہ کہ جب بندہ اللہ کو یاد کرے گا تو اللہ اس کے ساتھ ہوگا اور جب وہ اللہ کو فراموش کرے گا، تو اللہ اس کے ساتھ نہ ہوگا۔ گویا اللہ کی نصرت و رحمت اس کے قرب و معیت اور اس کی ولایت و حفاظت کے حصول کی لازمی شرط یہ ہے کہ انسان اللہ کو یاد کرے، اگر انسان اللہ کو یاد کرے گا تو وہ اسے اپنے سے دور پھینک دے گا۔ اپنی نصرت و رحمت سے اسے محروم کر دے گا، اور وہ اس کی سرپرستی و کارسازی کرنے کے بجائے اسے غلط کار لوگوں اور شیطانوں کے حوالے کر دے گا۔ انسان جس قدر اللہ کو یاد کرے گا اسی قدر وہ اللہ کی نصرت و معیت کا مستحق ہوگا اور جس درجہ وہ اللہ سے غافل ہوگا اسی درجہ اللہ سے دور اور شیطان سے قریب ہوگا۔ یعنی اللہ کی یاد اور اس سے طلب نصرت ہی دین کی اساس و بنیاد ہے اور اسی پر فلاحِ انسانی کا کُلّی انحصار ہے۔

اللہ کی یاد کیا ہے ؟ اللہ کے اسمائے حسنیٰ اور صفاتِ کمال کا زبان سے ورد، دماغ سے ان پر تدبر و تفکر، دل میں ان کا شعور و حضور۔ ان تینوں چیزوں کے مجموعے کا نام اللہ کی یاد ہے۔ انسان زبان سے جس قدر اللہ کو یاد کرے گا، دماغ سے جس قدر اللہ کے اسمائے حسنیٰ اور کمالات و صفات کو سمجھے گا، ان پر غور کرے گا اور اپنے دل میں جس قدر ان کے تصور کو جمائے گا، اتنا ہی اس کے دل و دماغ پر ان کے صفات کا گہرا نقش ثبت ہوگا، اتنا ہی اس کا ایمان زیادہ پختہ ہوگا، اسی قدر بندۂ ذاکر کا یقین مشاہدہ و احساس کی کیفیت اختیار کرے گا، اسی قدر انسان کے جذبات اس کی عقل سے ہم آہنگ ہو کر محبتِ خداوندی کی سعادت حاصل کریں گے، اور اسی قدر اس کی زندگی کے شب و روز یادِ الٰہی میں بسر ہوں گے اور اس کی حیاتِ مستعار کے تمام گوشے صبغۃ اللہ میں رنگتے چلے جائیں گے۔ اس کے برعکس انسان جس قدر اللہ کی یاد سے غافل ہوگا، اسی قدر وہ اس کی بندگی سے دور اور اس کی رحمت و نصرت سے محروم ہوگا۔

حدیث کا ایک جملہ یہ ہے کہ اللہ فرماتا ہے: "اگر وہ مجھے اپنے جی میں یاد کرتا ہے تو میں بھی اسے اپنے جی میں یاد کرتا ہوں"۔ جی میں یاد کرنے کا مطلب ہے، انفرادی طور پر یاد کرنا۔ یعنی اگر بندہ انفرادی طور پر اللہ کو یاد کرتا ہے تو اللہ بھی اسے انفرادی طور پر یاد کرتا ہے ۔۔۔ "اگر وہ مجھے مجمع میں یاد کرتا ہے"۔ یعنی لوگوں کے سامنے یاد کرتا ہے اور انسانوں کے اجتماع میں اس کا ذکر کرتا ہے، اس کے دین کی باتیں لوگوں کو بتاتا ہے، اس کے اسمائے حسنیٰ پر غور وفکر کی دعوت دیتا ہے، اس کی صفات کی وضاحت کرتا اور انھیں اسی طرح ماننے اور ان پر ایمان لانے کی تلقین کرتا ہے، جس طرح کہ وہ قرآن وحدیث میں مذکور ہیں۔ اس کے کمالات کو اجاگر کرتا ہے، قرآن مجید پڑھ کر لوگوں کو سناتا ہے اور اس کے اوامر ونواہی پر خود عمل بھی کرتا ہے اور لوگوں کو بھی اس پر عمل کرنے کی دعوت دیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس سے بہتر مجمع یعنی مقربین بارگاہِ الٰہی اور فرشتوں کی مجلس میں اس کا تذکرہ فرماتا ہے ۔۔۔ غور کیجیے، کتنا روح پرور اور وجد آفریں ہے یہ تصور کہ انسان جس دم اپنے رب کو یاد کرتا ہے، اس کا رب بھی اسی دم اسے یاد کر رہا ہوتا ہے، اور نہ صرف اپنے جی میں یاد کرتا ہے بلکہ اپنے مقربین بارگاہِ خاص میں اس کا تذکرہ کرتا ہے۔

"اگر وہ میری طرف ایک بالشت بڑھتا ہے"۔ حدیث کی اصل عبارت میں "تقرّب" کا لفظ ہے، جس کے معنی ہیں قریب ہونے کی کوشش کرنا۔ ظاہر ہے خدا کوئی مادّی اور محسوس شے نہیں ہے کہ انسان اپنے قدموں سے چل کر اس سے قریب ہوسکے۔ دراصل یہ پیرایۂ مجاز ہے۔ یعنی بات تشبیہ وتمثیل کے اسلوب میں کہی گئی ہے۔ گویا اللہ منزلِ مقصود ہے، بندہ مسافر ہے۔ اللہ کا دین راہ ہے اور اس پر چلنا سفر ہے۔ خود قرآنِ مجید میں کئی مقامات پر تشبیہ وتمثیل کا یہ اسلوب اختیار کیا گیا ہے۔ دینِ حق کو قرآنِ مجید میں بالعموم "صراطِ مستقیم" (سیدھی راہ) کہا گیا ہے یعنی اللہ کی رضا، اس کی رحمت اور اس کی مہربانیوں تک پہنچنے اور پہنچانے والی راہ کو سیدھی راہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

قَالَ هٰذَا صِرَاطٌ عَلَيَّ مُسْتَقِيْمٌ ○

اللہ نے فرمایا۔ یہ سیدھی راہ مجھ تک پہنچتی ہے۔

حدیث پیش نظر میں اللہ کا فرمان بیان کیا گیا ہے کہ "اگر وہ میری طرف ایک بالشت بڑھتا ہے تو میں اس کی طرف ایک ہاتھ بڑھتا ہوں" یہ بھی ایک تشبیہ ہے۔ یعنی بندۂ مومن جس قدر اللہ کے دین پر عمل کرتا ہے، اسی قدر قربِ خداوندی کی راہ پر گام فرسا ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ اپنے مخلص بندوں سے قریب ہونا چاہتا ہے۔ راہِ دین پر چلنے کی وجہ سے ایک طرف اگر بندہ اللہ سے قریب ہوتا ہے تو دوسری طرف سے اللہ اپنی رحمت کے ساتھ اس کی طرف بڑھتا ہے، اسے اپنی بندگی کی مزید توفیق دیتا ہے اور اپنی توجہ اور عنایت سے اس مشکل اور دشوار گزار راہ کو اس کے لیے آسان اور مختصر بنا دیتا ہے۔

یہ کتنی عجیب و غریب راہ ہے کہ جس میں صرف مسافر ہی منزل کی طرف پیش قدمی نہیں کرتا بلکہ منزل بھی دوڑ کر مسافر کے پاس آتی اور اس کے لیے آسانی پیدا کرتی ہے۔

اس حدیث میں جو چیز سب سے زیادہ ابھری ہوئی ہے وہ مومنین پر اللہ تعالیٰ کی غایت درجہ رحمت و رأفت، اس کی نصرت و معیت اور اس کا قرب و تلطف ہے، اور اس لحاظ سے یہ حدیث اہلِ ایمان کے لیے بہت بڑی بشارت ہے۔

دین کی اگر مجمل اور بنیادی تقسیم کی جائے تو اس کے تین گوشے ہو سکتے ہیں: (۱) ایمان (۲) ذکرِ الٰہی اور (۳) عملِ صالح۔ یہ حدیث ان تینوں گوشوں کو محیط ہے۔ پہلے ایمان باللہ ہے، پھر اللہ کے ذکر کی وہ صورتیں ہیں جو کتاب و سنت میں منقول ہیں۔ اس کے بعد زندگی کے ہر شعبے کو اعمالِ صالح کی مضبوط بنیادوں پر استوار کرنا ہے۔